© rasailojaraid.com

اقبال اور قوم کی نئی تعمیر

فضلِ حمید

حقیقی معنوں میں اقبال شناس تو معدودے چند ہی ہوں گے، لیکن حضرت مرحوم کے کلام کے ثناخواں، ناقد اور شارح بے شمار ہیں اور اسی لئے کلام اقبال کی تعبیرات و توجیہات بھی لاتعدّ و لاتحصیٰ ہیں۔

وللنّاس فیما یعشقون مذاہب' ایک کہتا ہے۔ علامہ نے یہ فرمایا ہے۔ دوسرا کہتا ہے یہ نہیں فرمایا، کچھ اور فرمایا ہے۔ اور تیسرا کہتا ہے کہ جو میں کہتا ہوں، اقبالؔ نے وہی بات کہی ہے۔ بعض کی سخن سنجی کا یہ حال ہے کہ اقبال کے بہترین اشعار کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہیں کہنا پڑتا ہے کہ "شعر فہمیٔ عالم بالا معلوم شد" علامہ مرحوم عالم مثال میں یہ کہتے ہوں گے کہ "من چہ می سرائم و طنبورۂ اینہا چہ می سراید" عجب نہیں کہ اسی تاثر کے تحت انہوں نے یہ شعر کہے ہوں۔ ؎

چوں رخت خویش بر بستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست ایں فقیرے — چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

ان کے یہ اشعار بھی اسی حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں:۔

بہ چشم من جہاں جز رہگذر نیست — ہزاراں راہ رو یک ہمسفر نیست
گذشتم از ہجومِ خویش پیوند — کہ از خویشاں کسے بیگانہ تر نیست

شاید اس ضمن میں مولانا رومؒ کے یہ اشعار زیادہ حسب حال ہیں۔ گو محل و مصداق کلام کا تفاوت جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

من بہ ہر جمعیتے نالاں شدم
جفتِ خوش حالاں و بدحالاں شدم

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من
وز دُرونِ من نہ جُست اسرارِ من

بایں ہمہ اس میں شک نہیں کہ مزاج، طبیعت اور استعداد کے لحاظ سے معنی کی تعبیریں بدل جاتی ہیں۔

عباراتنا شتیٰ و حُسنکَ واحدٌ

اہلِ نظر کے لئے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اقبال نے کیا نہیں کہا؟

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم!

حضرتِ اقبال کی ہمہ گیر، ہمہ رس، ہمہ رنگ طبیعت اور آزاد فطرت کسی محدود دائرہ میں مقید نہیں ہو سکتی تھی اور نہیں ہوئی۔ مغز و پوست کی بات دوسری ہے۔

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

میرے خیال میں اقبال کی فلسفیت نے ان کے کلام کی شعریت میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا البتہ اقبال کی شاعری نے ان کی فلسفیت کو کمزور کر دیا یا الجھا دیا ہے۔ مگر جب وہ اپنے شاعرانہ وارادات یا باطنی وجدان کے تقاضے سے شعر کہتے ہیں تو فی الحقیقت یہ شعر ہوتے ہیں اور کمالِ شاعری کے اعتبار سے لاجواب۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ الشعراءُ تلامیذ الرحمٰن۔ اقبال کے کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ گلدستے ہیں، جن میں انہوں نے مشرق و مغرب کے حکماء، شعراء اور فضلاء کے رنگا رنگ افکار اپنے اشعار کے سانچوں میں ڈھال کر موزوں کئے ہیں ثانیاً حکمت بہ قیدِ ردیف و قافیہ۔ ثالثاً شاعرانہ واردات والہامات اور یہی اصل میں ان کی شاعری کی جان ہیں۔ اسی قسم کے اشعار کے بارے میں فیضی کا دعویٰ ہے۔

نشۂ فیضی بود از بزمِ خاص
جرعۂ جامش ز فیضِ عام نیست

اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت کے اعتبار سے لامحدود اور ایک ارتقاء و تغیر پذیر عالم میں قیدِ زمان و مکان سے بالاتر ہے۔ اس کی فطرت کی ممکنات بھی لامحدود ہیں۔ نہ مبدائے جمال و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کمال یعنی حقیقت کی انتہا ہے اور نہ مظہرِ حقیقت یعنی انسان کی ممکنات کی کوئی حد ہے۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں

غالب بھی ایک ہر دم دگرگوں عالم کے قائل ہیں۔

در ہر مژہ بر ہم زدن ایں خلقِ جدید است
نظارہ سگالد کہ ہماں است و ہماں نیست

مگر "تجددِ امثال" کے پرانے خیال کا ایک اندازِ بیان ہے۔ غالب عالم کے تحسینی ارتقاء کو بھی ایک نہایت لطیف و بدیع شاعرانہ پیرایہ میں یوں بیان کرتے ہیں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یہی مضمون اقبال نے اس شعر میں بیان کیا ہے، مگر شعریت اور معنوی لطافت کے اعتبار سے اقبال کا قدم آگے بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اسی سے ملتا جلتا کسی پرانے فارسی شاعر کا یہ شعر ہے۔

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند — ستارہ می شکنند و آفتاب می سازند

اقبال کے تخیل کی جدت آفرینی نے ایک ارتقاء پذیر عالم کے تصور پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ وہ ایک نئی دنیا کی جستجو میں بھی ہیں۔

زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

یہی نہیں وہ ایک نئے انسان کی تخلیق کے بھی متمنی ہیں۔ جنابِ باری تعالیٰ میں شاعرانہ شوخی سے عرض کرتے ہیں۔

نقشِ دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار — لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

ایک اور جگہ وہ اس خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ:-

خدا خود در تلاشِ آدمی ہست

اپنی علمی ہمہ رنگی اور فکری بوقلمونی کا خود اقبال کو اعتراف ہے:-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ے رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

فکر و نظر کی اس گوناگونی کے باوجود چند مرکزی و اساسی تصورات ہیں، جو حضرت اقبال کے تمام کلام میں پائے جاتے ہیں۔ گو بعض مشاکلات و متشابہات میں ہمارا متخیلہ حیران اور ناطقہ سر بہ گریبان رہ جاتا ہے مگر اس سے ان کی فکری وحدت میں کوئی تضاد یا تخالف واقع نہیں ہوتا۔ اس مقالہ میں یہ گنجائش نہیں کہ ان کے اس مرکزی خیال کی توضیح و تشریح کی جائے۔ مزید برآں یہ کہ موضوع سخن بھی اس کا متحمل نہیں۔

مختصراً اتنا عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اقبال کے نزدیک زندگی ایک رواں دواں روح یعنی بقولِ برگساں ایک "جوہر سیال حیات" ہے جو ساری کائنات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ روحِ حیات انسان کے وجود بلکہ جملہ کائنات کی عین ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ے تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

انسان کا وجود یعنی بود و نمود تخلیقِ مقاصد پر منحصر ہے اور ان روایات کے تحفظ پر جوانِ مقاصد کی حامل ہیں۔

ے ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

لیکن کشاکشِ آرزو اور تخلیقِ مقاصد کے بغیر زندگی کا استمرار و دوام ممکن نہیں

زندگانی را بقا از مدعا است	کاروانش را درا از مدعا است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار	تا نگردد مشتِ خاک تو مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بو ست	فطرتِ ہر شے امین آرزو است
آرزو صید مقاصد را کمند	دفتر افعال را شیرازہ بند
زندگی سرمایہ دار از آرزو ست	عقل از زائیدگان بطنِ او ست

یہی نہیں ۔ سوز و سازِ آرزو کو نہ صرف وہ شرطِ حیات قرار دیتے ہیں بلکہ عینِ حیات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمجھتے ہیں۔

اگر ز رمزِ حیات آگہی مجو دگیر
دلے کہ از خلشِ خار آرزو پاک است

اقبال کا یہ خیال بھی ان کے ایک اور بنیادی تصور کا مرہونِ منت ہے مدعا یہ کہ انسان فطرت کا محکوم نہیں۔ از روئے قابلیت فطرت اس کی محکوم ہے۔ انسان کی روحِ فعّال کارفرمائی فطرت سے برسرِ پیکار ہے اور انسان کی انانیت کا مقصد تسخیرِ کائنات ہے۔ عالمِ آب وگل میں انسانی ممکنات کا بروئے کار آنا اس کی انا کی قوت کے ظہور پر موقوف ہے ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا
قسمتِ بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا

غالب نے کہا تھا۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اقبال نے "میکدہ" اور "دعوتِ عام" کے تلازمہ سے مضمون اونچا کر دیا ہے۔ اور توسیعِ ممکنات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ "اندازۂ جام" عبارت ہے ظرفِ استعداد سے۔ استعداد کا مسئلہ بڑا نازک ہے مگر اس میں خودی کی لامحدود قوتِ سعی و حصول کی گنجائش کہاں ہے؟ بہ ہر کیف اقبال انسان کی تقدیر گر و تقدیر شکن قوت کے قائل ہیں اور روشِ زمانہ اگر سازگارِ مقاصد نہ ہو، تو اس کے خلاف معرکہ آزما ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس بنا پر ان کی بے پناہ تنقید کی زد سے سعدی شیرازی بھی نہ بچ سکے۔ سعدی نے کہا تھا "زمانہ با تو نہ سازد۔ تو با زمانہ بساز" یہ "لاتسبّوا الدہر" کی ہی شرح تھی۔ مگر اقبال کے فلسفۂ ستیزہ سخت کوشی میں اس ہم آہنگی کی گنجائش نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

حدیثِ بے خبراں ہے تو بہ زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اس آویزش کے باب میں بجز اس کے اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ بقولِ سعدیؔ۔ "سعدی آں نیست ولیکن چوں تو فرمائی ہست!" اگر مے و محبوب کی مقاصد و مطامع سے تعبیر کی جائے تو کسی شاعر کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ شعر اقبال کے مشرب کا آئینہ دار بن جاتا ہے اور کلام کی موسیقیت و شعریت میں کوئی خلل نہیں آتا۔

مشرب اہل نظر عشق مدام است اینجا
زندگی بے مے و محبوب حرام است اینجا

برسبیل تذکرہ بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ اقبال اپنے فلسفۂ انانیت و لاغیریت کے باوجود ہر عظیم مفکر و شاعر کے خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال طبع زاد شاعر ہیں اور ہر طبع زاد شاعر میں قوتِ منفعلہ بحدِ کمال ہوتی ہے۔ اگر یہ انفعالیت نہ ہو تو شعر موزوں نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال شیکسپیر اور ورڈز ورتھ، غالب اور گوئٹے، نیٹشے اور رومی، کارل مارکس اور شوپن ہار ایمرسن اور سوامی رام تیرتھ فکٹے اور ہیگل سے یکساں متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ حافظ کی تاثیر بھی انکے کلام میں پائی جاتی ہے۔ دراں حالیکہ حافظ پر انہوں نے کڑی تنقید اور سخت جرح کی تھی۔

"پیر رومی" اور "مرید ہندی" کے مسلک میں جو بعد المشرقین ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ جب ان کی قوتِ فعالہ بروئے کار آتی ہے، تو ان کا کلام فلسفہ منظوم بن جاتا ہے۔ جب وہ اپنے قلبی واردات سے شعر کہتے ہیں تو وہ شعر ہوتے ہیں۔ اتنی ہمہ رس و ہمہ گیر طبیعت شاید ہی کسی شاعر کو مبدائے فیاض سے ملی ہو۔ آخر گلہائے رنگا رنگ سے ہی چمنِ خیال کی زینت ہے۔

اقبال روحِ حیات کی ابدیت اور لازوالیت کے قائل ہیں اور انانیت کے کمال کے لئے مقاصد کی بلندی اور مطامع کی پاکیزگی لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اس تمیزِ رنگ و بو کے عالم میں جَو بوئیں اور آخر کار گندم کی فصل برداشت کریں۔ سعدی کے اس شعر کو انہوں نے بہ نظر استحسان اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

اقبال فلسفۂ وحدت الوجود سے بھی بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اگرچہ بظاہر ان کے فلسفۂ خودی میں اس کی گنجائش بہت کم نظر آتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی — کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی — تلاش خود کنی جز او نیابی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن شاید "یہ گلشن راز" کی صدائے بازگشت ہے۔ وجودیوں کی تعبیرات سے اقبال کو شدید اختلاف ہے کیونکہ وہ خودی کو ہست یعنی حقیقت سمجھتے ہیں اور جملہ موجودات کو نیست، یعنی تخلیقاتِ خودی کا اعتبا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایک لحاظ سے اِلٰہ کی نفی بھی ہوتی ہے۔ اس کا انہیں احساس ہے اس تشکیک و تذبذب کا اظہار وہ اسطرح کرتے ہیں۔

تو می گوئی کہ من ہستم خدا نیست — جہانِ آب و گل را انتہا نیست
ہنوز ایں راز بر من ناکشود است — کہ چشمم آنچہ بیند ہست یا نیست

اقبال کے نزدیک قوم کے جہانِ نو کی تعمیر سنگ و خشت سے نہیں بلکہ افکار عالیہ اور مقاصدِ حسنہ سے ہوتی ہے جن کا ایسا لطیف امتزاج ہو، جو انسان کے جوہرِ حیات کو مثلِ گوہر تابندہ بنا دے اور اسے اُمہات سفلی اور آباءِ علوی یعنی عناصر اربعہ اور عناصرِ فلکیہ پر غلبہ حاصل ہو جائے۔ اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے ضبط نفس اور تربیتِ خودی پر زور دیا ہے۔ جن کے کمال کو وہ نیابت الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ قوموں کا عروج و اقبال اور ان کی اخلاقی و ثقافتی عظمت کا دارومدار سر بفلک عمارتوں اور عظیم الشان کارخانوں پر نہیں بلکہ اخلاقی و روحانی قدروں کی سربلندی و ترقی پر ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس راہ میں وہ محکومی و تقلید کو سنگ گراں سمجھتے ہیں اور یہ افسوس کرتے ہیں کہ ہمارے فکر کی اجتہادی قوت ہمیں جواب دے گئی ہے۔

حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اور اس سلسلہ میں وہ اس زوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو تدریجاً ہمارے قومی ارتقاء کی رجعتِ قہقری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا باعث ہوا۔ یہاں تک کہ خوب و زشت کا امتیاز بھی جاتا رہا۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبال کے حق میں مدح سرائی اور داد واہ ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد خوب ہوئی مگر تحسین قدر شناس کی کمی اب تک محسوس ہو رہی ہے۔ شاید ان کا روئے سخن اسی ناگوار صورت حال کی طرف ہے۔

جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے

البتہ اس راہ میں کچھ دشواریاں بھی ہیں اور "مرد مومن" یعنی انسان کامل کے جذبات و داعیات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قربانیاں ناگزیر ہیں۔ پنڈت ہرگوپال تفتہ نے اس مسلک کی کیا خوب ترجمانی کی ہے

بہ کوثر غوطہ ہا زد ہر کہ اندر خوں تپید اینجا مجت کربلائے ہمت باید شد شہید اینجا

اقبال نے بھی یہی بات اپنے رنگ میں کہی ہے۔

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایہ حیات فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ

سفرِ حیات میں علامہ اقبال کے نزدیک جس زادِ راہ کی ضرورت ہے وہ بیش از یں نہیں۔

چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بے تابے

مقصد حیات کا جو تصور اقبال کے دل و دماغ میں ہے اسے وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز از شرابِ مقصدے مستانہ خیز
مقصدے مثل سحر تابندۂ ماسوا را آتشِ سوزندۂ
مقصدے از آسماں بالاترے
دلربائے دلستانے دلبرے باطل دیرینہ را غارتگرے
فتنہ در جیبے سراپا محشرے

وہ درد کے بھی قائل ہیں مگر دردمندی اور جانداری ان کے ہاں ہم معنی ہیں۔

کسے کو دردِ پنہانے نہ دارد تنے دارد ولے جانے نہ دارد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان مقاصد کی مزید تشریح کرتے ہوئے وہ روح کی پاکیزگی پر بھی زور دیتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر روح کی بلند پروازی یا بلند آہنگی نہ رہے تو محض اخلاقی اقدار انسانیت کبریٰ کی تخلیق نہیں کر سکتیں اور نہ آدمی کو اس منزلِ مقصود تک پہنچا سکتی ہیں جو اس کی زیست کا مدّعا یعنی عین وجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید   ضمیر پاک و خیال بلند و ذوقِ لطیف

ملّتِ اسلامیہ کے لئے ان کا پیام خاص ہے اور طرزِ خطاب بھی یقین اجابت کی آئینہ دار ہے کیونکہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ امّت محمدیہ کی تشکیل انسانیتِ کبریٰ کی تخلیق اور وحدت انسانی کی تکمیل کے لئے معرضِ وجود میں آئی ہے۔

ان کے نزدیک۔ "خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے"۔ ابن عربیؒ کے نزدیک جمادات بھی زندہ ہیں مولانا رومؒ کا خیال ہے۔ "زندہ معشوق است و عاشق مردہ"۔

توحید کا جو تصوّر علامہ اقبالؒ نے پیش کیا ہے اس کی تشریح کا یہ مقام نہیں ہے مگر ملّتِ اسلامیہ کی وحدتِ افکار کو وہ اسلامی توحید کا جزو لاینفک قرار دیتے ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام ہے بیکار

یہاں محلِ نظر یہ بات ہے کہ دنیا میں یکسانیت ہی یکسانیت ہو تو تنوع کی دلفریبی کہاں سے آئے گی۔ بقولِ ذوقؔ۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن   اے ذوقؔ اس جہان کو ہے زیب اختلاف سے

آخر میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ ہماری ذہنی تنگ دامانی اور بے حوصلگی اور کوتاہ دستی کی دلیل ہو گی اگر ہم اقبالؔ کی روح پرور، ہمت افزا ولولہ انگیز شاعری کے باوجود بھی اپنی قوم کی تعمیر نو نہ کر سکیں اور قوم کی تعمیری ترقی کو سنگ و خشت کے سطحی پیمانوں سے ہی ناپتے تولتے رہیں۔ خدا نہ خواستہ یہ صورت ہوئی تو ہماری مثال چلتی پھرتی لاشوں سے زیادہ نہ ہو گی۔

اخلاقی اور روحانی قدریں اگرچہ قوم کی اصلی حیات کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن وہ مالیات یا مادیات کی تخیلی تنگ نائے میں سما نہیں سکتیں۔ جو کم نظر قومی ترقی کو ثقافت کی قدروں اور جمالیات ـــــ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی انسانی فطرت کے حسن و کمال سے الگ کرکے دیکھتے ہیں، وہ اس ذوق لطیف، احساس سربلندی اور شعورِ ماکان و مایکون سے محروم ہیں جو قومی زندگی کی ہم آہنگی اور وحدت فکر و عمل کے لوازم ہیں۔ کوئی قوم اپنی ثقافتی، علمی اور روحانی بے مائیگی کے باوجود محض مرئی اور ٹھوس مادی ترقی سے دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ یا کم ازکم عزت و افتخار کا مقام حاصل نہیں کرسکتی۔ میکالے کا یہ قول کہ وہ برطانوی شہنشاہیت سے دستبردار ہونے کو تیار ہے مگر شیکسپیر کے ثقافتی سرمایہ سے دست کش ہونے پر آمادہ نہیں، اسی بالغ نظری پر مبنی تھا۔ حضرت حافظ کے اس شعر میں بھی یہی رمز بعنوانِ دگر مذکور ہے۔

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دل مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حسن طبیعت، سوزِ باطن، ذوقِ سلیم اور توازنِ فکر کے بغیر انسان اجتماعی طور پر ان مقاصد حیات کی تکمیل نہیں کرسکتا جو اقبال کے نزدیک اصل الاصول ہیں۔ فلسفۂ خودی سے ان عناصر ترکیبی کی کیا نسبت و اضافت ہے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا، بہرکیف مقامِ حیرت و تاسف ہے کہ اقبال پرستی اور کلام اقبال کے ساتھ والہانہ عقیدت و دل بستگی کے ہوتے ہوئے بھی قوم تعمیر نو کے تقاضوں اور اخلاقی و روحانی قدروں کی ترقی و تعالی سے غافل ہے۔ اس سلسلہ میں کسی دیدہ ور کا یہ شعر حسب حال ہے۔

زتیرہ بختیٔ آئینہ حیرتے دارم
ترا کشید بہ آغوش آفتاب نہ شد

بایں ہمہ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ اقدار کی آزمائش کے امکانات غیر محدود ہیں اقبال نے کہا ہے کہ تقدیرات لاانتہا ہیں مشہور مقولہ ہے کہ روما کا شہر ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا تھا۔ قوموں کی تعمیر میں بھی وقت لگتا ہے۔ بقول اقبال کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ۔

منزلِ عشق گرچہ بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

جس طرح قوموں کا زوال و انحطاط اجمال و تدریج سے ہوتا ہے، اسی طرح ان کا عروج و اقبال بھی تحمل اور سعیٔ پیہم کا محتاج ہے۔ کہنے کو تو یہ حسن اتفاق ہے لیکن انتظامِ عالم میں سعیٔ مسلسل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقدیراتِ حیات کی تعدیل معادلہ میں جملہ شرطیہ کا اعتبار رکھتی ہے۔ جس طرح ہم کبھی کبھی حوادث ناگہانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح کبھی کبھی سرا پا خوش نصیبی کی دولت بھی ہاتھ آجاتی ہے مگر یہ تو نہ ہو کہ جامہ نہ دارم دامن از کجا آرم، کا مضمون ہو جائے۔ گو شاذ و نادر ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ عاملان قضا قدر جامہ بھی دیتے ہیں اور دامن بھی بھر دیتے ہیں۔ بہ ہر صورت راہِ طلب میں شرطِ سفر ناگزیر ہے۔

دادیم ترا ز گنجِ مقصود نشاں
گر ما نہ رسیدیم تو شاید برسی

اور اس جد و جہد یعنی منزلِ عشق کی شرطِ اول یہ ہے کہ۔

ع پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اور یہ اس لئے کہ کسی ادا شناسِ فطرت کا قول ہے۔

شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

عصرِ حاضر کی لادین اشتراکیت کا مطمحِ نظر بے شک نسبتاً زیادہ وسیع ہے، اور اس کے جوش و سرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا، لیکن اس کی اساس چونکہ ہیگل کے مخالف نظر متبعین پر ہے، لہٰذا وہ اس چیز ہی سے برسرِ پیکار ہے، جو اس کے لئے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی بہرحال یہ وطنیت ہو، یا لادین اشتراکیت، دونوں مجبور ہیں کہ بحالتِ موجودہ انسانی روابط کی دنیا میں تطابق و توافق کی جو صورت ہے، اس کے پیشِ نظر کسی کو نفرت، بدگمانی اور غم و غصہ پر اکسائیں۔ حالانکہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے تک پہنچ سکے۔

(از تشکیل جدید الہیات اسلامیہ مترجم سید نذیر نیازی)

© rasailojaraid.com